

ہوائی

دنیا کے حسین سفر ہمیشہ مجھ پر مسلط رہے ہیں یہ ایک اور سہمی۔ کچھ اتنے لمبے ہوائی سفر کا ڈر، کچھ ایک صاحبہ نے ڈرایا کہ ٹوکیو سے ہونولولو تک نیچے بجز اکانل ہوتا ہے اور اوپر خدا۔ کہیں زمین کا ذرا سا ٹکڑا بھی ڈھارس کے لیے دکھائی نہیں دیتا اور معمول کے مطابق اگر طوفان آجائے تو پھر الامان! سفر اللہ اللہ کرتے گزرتا ہے۔ پیٹ میں ہول اٹھے۔ لیکن میرے میاں تو تین مہینے پہلے جا چکے تھے۔ اس لیے مراجعت ناممکن تھی۔ اوکھلی میں سردیا تو ان دھمکوں سے کیا ڈرنا۔ بوریا بستر باندھا (بستر تو ہوتا ہی نہیں یہ محاورے کی بات ہے) گھر سمیٹ کر ایک گیراج میں بند کیا۔ گھر سمیٹنے میں اب طاق ہو گئی ہوں۔ اس طرح پل بھر میں اس کی گٹھڑی باندھ کر الگ کرتی ہوں کہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی جو اب کالج کے پہلے سال میں تھی، ساتھ ہوئی۔ بڑی دولڑکیوں کے بی اے کے امتحان تھے ان کو ڈھائی مہینے بعد آنا تھا۔ کراچی پہنچ کر بی، او، اے، سی کا ٹکٹ بک کر آیا۔ اس غریب لائن سے اگر جانا ہو تو ۲۴ گھنٹے کی گنجائش رکھنی چاہیے۔ اگر ۲۶ کو جانا ہو تو ۲۵ کی سیٹ بک کر اؤ۔ کیونکہ وہ چودہ سو چالیس منٹ سے کم لیٹ ہونا کسرشان سمجھتی ہے لیکن میں پھر بھی ہمیشہ اسی ہوائی کمپنی کو چنتی ہوں، کیونکہ اس کی نشست آرام دہ ہوتی ہے اور عملہ تمیز دار۔ تو خیر ہم نے پہلی ٹھیک ٹکٹ میں لگائی۔ کلکتہ میری جائے پیدائش ہے، حالانکہ میں صرف ایک سال کی شیرخوار وہاں سے لے آئی گئی تھی لیکن پھر بھی اس جگہ سے اُنس تھا۔ اس کو دیکھنے کا ارمان تھا لیکن میرے جذبات نے مجھے ہمیشہ دھکے کھلائے۔ ایئر پورٹ سے لے کر پولیس اسٹیشن تک جو میرا اور باقی مجھ جیسے سیاحوں کا حال ہوا وہ ناگفتہ بہ ہے۔ خدا کسی شریف انسان کو کلکتے نہ لے جائے۔ اگر مرزا غالب نے اس میں کچھ دیکھا تو ہندوستانی کسٹم آفیسر اور بنیا پولیس سے پہلے دیکھا ہوگا۔ قصہ کوتاہ ہم نے جلدی سے اپنی جان چھڑائی اور ہانگ کا نگ سٹروانہ ہوئے۔ وہاں جا کر روح خوش ہو جاتی ہے۔ تازہ دم ہو کر ٹوکیو روانہ ہوئے۔ راستہ سخت طوفانی تھا۔ کجخت ”بین ایم“ سگ پرانا کھٹارا جہاز چار گھنٹے لرزتا رہا اور ہمیں لرزاتا رہا۔ ساتھ بیٹھا جاپانی تاجر تسلی دیتے ہوئے بولا: ”یہ تو کچھ بھی نہیں۔ جب ٹوکیو سے ہوائی جاؤ گی تو ہوائی جہاز ایسے اچھلے گا جیسے چھاج میں گیہوں۔“ ہم نے اِناللہ پڑھ لیا اور ارادہ کر لیا کہ میاں کو ہوائی میں ہی رہنے دیں اور ہم ٹوکیو میں ان کی واپسی کا انتظار کریں، لیکن خاک چھانسنے کا شوق خوف و خطر پر غالب آ گیا اور جنرل شیخ اور بیگم شیخ کی خاطر مدارات کا مزا کچھ کر، دو دن ٹوکیو ٹھہر کر جل تو جلال تو کہتے ہوئے جاپان ایئر لائنز میں بیٹھ گئے۔ ہوائی جہاز

چلا تو ہم نے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ یارب ہماری عزت رکھ لے اور خیر سے سفر پورا کر دے۔ میرے مولانا میری مراد ایسی پوری کی کہ سارا سفر آسمانوں میں ریشم کی طرح سرسر کرتا گزر گیا۔ میں نے اتنے خوش گوار چٹھے گھنٹے کبھی نہیں گزارے تھے۔

رات کو ساڑھے دس بجے ہمارا جہاز ہوائی کے دارالسلطنت ہونولولو میں اترنا۔ میاں کو تار دے دیا تھا۔ اُمید تھی کہ ہوائی اڈے پر ہار لے کر پہنچیں گے۔ جزیرہ ہوائی کی یہ ایک رسم دیرینہ ہے کہ ہر آنے والے کا پھولوں کے حسین گجروں سے استقبال کیا جاتا ہے، اس لیے ارمان تھا کہ کم از کم میاں تو پھول نچھاور کرنے پہنچ جائیں گے، لیکن میاں ریاض الدین صاحب حسب معمول غائب، رات کا وقت، مجھے ان کا پتا بھی نہیں معلوم۔ جناب بلی کی طرح تین گھر تبدیل کر چکے تھے۔ ہوائی کی یونیورسٹی میں فون کیا تو انھوں نے کہا، ایسٹ ویسٹ سنٹرل سے پوچھو۔ اتنے میں ایک ٹیکسی والا آگے بڑھا، میں وہاں تک آپ کو لے جاتا ہوں، باقی پھر دیکھا جائے گا۔ ہائی راز ہوٹل ٹینک پہنچے تو اونچی اونچی عمارات، بتیاں جل رہی ہیں، طلبہ پڑھ رہے ہیں لیکن ہمارے میاں ندارد۔ غصہ اور پریشانی دونوں مل گئے۔ یہ اچھا استقبال ہو رہا ہے۔ رات کے بارہ بجے! تین مہینے بعد بیوی آئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اتنے میں ایک کارٹریکٹوں سے لدی پھندی چینی چلاتی آن کر رکی۔ انجان شکلوں نے میرے گلے میں ہار ڈالے۔ پیچھے ایک اور کار اس میں گٹار پر کچھ نوجوان ہوائی کے گیت گاتے ہوئے اترے اور ان نوجوانوں میں چھپے ہوئے میاں ریاض الدین مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں حسب معمول برستی، ان کی سہیلیوں نے سمجھایا کہ تار پڑھنے میں غلط فہمی ہو گئی۔ ہوائی کا وقت جاپان کے وقت سے ۲۴ گھنٹے پیچھے ہے اس لیے اکثر تاریخوں میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ ہم نے جل کر کہا کہ اصل گڑبڑ تو ہماری شادی کی تاریخ سے شروع ہوئی تھی، بہر حال خدا کا شکر ادا کیا، ٹیکسی والے کا شکر یہ ادا کیا۔ پھر گھر روانہ ہوئے۔

مجھے گھر دیکھنے کا شوق لیکن ریاض صاحب نالتے جائیں کہ تم صبح آرام سے دیکھنا۔ ابھی کمروں میں بتی مت جلاؤ اور اس کی وجہ سمجھ میں آئی جب گھر کے ہر کونے میں منوں کوڑا اور گردوغبار دیکھا۔ ہر دراز سے میلے موزے اور رومال، ہر جیب سے تھیٹر، سنیما فلور شوکی پرچیاں اور ریز گاری، پینٹری کے میں پانچ دن سے برتن بغیر دھلے پڑے تھے۔ میاں بجائے برتن دھونے کے نئے برتن نکال نکال کر استعمال کرتے جاتے تھے۔ اس طرح درجنوں موزے، رومال، بنیان خرید ڈالے تاکہ پرانے دھونے نہ پڑیں۔ بہر حال رات کو دو بجے تک اودھم مچتا رہا، پھر ہمسائے کی گرج دار آواز آئی: ”خاموش!“ ہم عموماً ہمسائے کی بات نہیں سنتے۔ لیکن یہ ہمسایہ ہوائی کا مشہور پہلوان اور ہیوی ویٹ چیمپیئن تھا اور نام بھی تھا ہارڈ ہائلڈ ہیگرتی کے لیے اس کی ایک تصویب ہی کافی تھی۔ دو منٹ کے اندر سب لڑکے لڑکیاں غائب، خیر ہم تھکے ہارے سو گئے۔ واللہ اعلم کب اٹھے، میاں

دفتر جا چکے تھے۔ ناشتا خود بنایا زندگی میں پہلی دفعہ خود کھانا پکانا تھا، اس لیے کام کا پتا ہی نہ چلا۔ اب آٹے وال کا بھاء معلوم ہوا۔ میری بیٹی ناز اور میں نے کمر کس کر سارا دن گھر کی صفائی کی اور لُنج قریبی ہوٹل میں جا کر کھایا۔ رات کو بھی کچھ نہ پکایا۔ جالے، چیونٹیاں اور گرد ہٹا ہٹا کر کمر دکھ رہی تھی۔ یہ جو میاں کی سات پشتوں پر احسان کیا تھا۔ شام کو ہم جزیرے کا اولین معائنہ کرنے کا کار میں گئے۔ ڈھلتے سورج میں بحر اکاہل کروٹیں بدل رہا تھا اور چاروں طرف زمر کی آمریت مستحکم ہو چکی تھی۔ تاحد نظر سبزہ ہی سبزہ، یوں احساس ہوا کہ جزیرے اووا ہولہ میں گہنہ مشق کائنات نئے سرے سے شباب پر آئی ہے۔ اس کے ننھے منے رقبے میں فطرت کا ہر رنگ ہر انگ پایا جاتا ہے۔ سمندر یہاں عمیق تر ہوتا چلا گیا ہے۔ یہ جنوبی یورپ کے آبی کناروں سے زیادہ نیلا اور چمکیلا ہے۔ دوپہر کے وقت اس نیلم کی بھڑک آنکھیں خیرہ کر دیتی ہے۔ میں نے وجدانی حسن میں اس طرح ڈوبے ہوئے ساحل بہت کم دیکھے ہیں۔

یہاں کے کوہساروں نے اس جزیرے کے گول چہرے کو ایک نیا زاویہ بخشا ہے۔ یہ کہیں سنگلاخ ہیں اور کہیں اتنے سبز کہ ازلی برساتوں کا ترین بسیرا معلوم ہوتے ہیں۔

اگلے دن ہم سب نے ہنوما بے پر پک تک منائی۔ یہ جگہ مجھے ایسی بھائی کہ دوڑی چھوٹی ادھر ہی کا رخ کرتی تھی۔ یہاں پانی سب سے مہذب اور شفاف تھا۔ یہ ساحل آبی مخلوق کے لیے مشہور تھا اور ہوائی کی یونیورسٹی دنیا بھر میں علوم سمندر میں سبقت لے گئی ہے۔

غرض یہ کہ اول تو قدرت نے اپنے حسن کے لنگر یہاں جاری کر دیے تھے، جو کچھ کمی تھی وہ انسان نے پوری کر دی۔ اس شام ہم گھر کا سارا سودا لینے سپر مارکیٹ گئے۔ بہت سے صاحبان اس ادارے کو جانتے ہیں لیکن بہت سی میری ہم وطن بہنیں اس کے متعلق جاننا چاہیں گی۔ تو سنیے سپر مارکیٹ امریکن سرمایہ داری کا مکمل مظاہرہ اور امریکن طرز حیات کا بنیادی قلعہ اور اس کی لامحدود افراط کا ذخار ہے۔ جب سے یہ بروئے زمین برسر پیکار ہوا، منہمی منہمی دکانیں اور چھوٹے چھوٹے بساطی پنساری دیوالیہ ہو گئے۔ یہ سپر مارکیٹ دس بازاروں کا مہا گرو ہے۔ ساری انارکلی اور مال روڈ کی دکانوں کا سامان اس کی ایک لپیٹ میں سما جائے۔ آپ جب داخل ہوں تو فوراً چار پہیوں والی ٹرائی ساتھ لے لیں کہ جفتے دو جفتے کا راشن اس میں ڈالتی جائیں اور جب خود چلتے چلتے تھک جائیں تو اس میں بیٹھ جائیں اور کسی اور سے کہیں کہ آپ کو کھینچے۔ صرف یہ آخری نصیحت میری اختراع ہے، ورنہ درحقیقت سپر مارکیٹ ایسی شیطان کی آنت ہے کہ دل چاہتا ہے کہ خود ٹرائی میں لٹک جائیں۔ اس ادارے کی افراط دیکھ کر انسان ایشیا، افریقہ کی بھوک اور قحط بھول جاتا ہے۔ اس جگہ بلا ارادہ اور بلا ضرورت

خریداری کرنی پڑتی ہے۔ ہر شے کی پچاس قسمیں اور ہر قسم چھت تک چنی ہوئی۔ ہر دوسرے قدم میں سیل لکھا ہوا۔ اگر نقد نہیں تو ادھار لیجیے۔

سپر مارکیٹ میں جا کر عورت کی آنکھیں اور بٹوے کھل جاتے ہیں۔ میں نے پہلے ہی پہلے میں ۳۲ ڈالر کی کھانے پینے کی چیزیں لے لیں۔ کار بھر گئی۔ اس مارکیٹ میں الگ زمری بھی ہوتی ہے، جہاں عورتیں اپنے بچے چھوڑ کر اطمینان سے شاپنگ کرتی ہیں۔

میاں نے ہمارے پیچھے کچھ گھر کا سامان مثلاً سیکنڈ ہینڈ کار، ٹیلی وژن، صوفہ، گراموفون، ٹیپ ریکارڈر اور باغ کی ہلکی کرسیاں وغیرہ خرید رکھا تھا۔

اتنا سلیقہ میرے میاں میں کہاں سے آ گیا۔ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن یہ سب ایک دکان کے ٹوٹل سے ہوا ہے جو غریبوں، مفلو جوں اور یتیموں کے لیے چلائی گئی تھی۔ اس لیے میرے میاں نے خیرات کے جذبے میں اپنے گھر کو پھینچ فرنیچر سے بھر لیا۔ کار ۱۸۵ء کا ماڈل تھی۔ جب چلتی تو دنیا دیکھتی تھی اور جب رکتی تو دنیا شکر کرتی تھی۔ اس کے پر اسرار پٹانے نہ معلوم کہاں سے چھوٹے تھے، ہم نے جاتے ہی کام بانٹ لیے، میں کھانا پکاؤں گی، بیٹی صفائی کرے گی۔ میاں بولے، ہم تمھاری ڈرائیوری کریں گے۔ ہم لا جواب ہو گئے۔ اس لیے کوئی اور کام ان کو نہ دیا کیونکہ اس کار کو چلانا انھی کا کام تھا۔ میں باہر ملک میں اگر کار چلاؤں تو کم سے کم مانوس ڈھانچہ تو ہو۔ اس کم بخت کے گیزر کدھر اور بریک کدھر۔ بالکل بے سرو پا۔ لیکن شاباش ہے اس کار پر کہ ہزاروں میل سیریں کیں لیکن اس نے ایک دفعہ بھی دغا نہ دی۔ پرانا ٹیلی وژن کچھ ایسا برانہ تھا۔ دودھ پلگاؤ یا گرم کبیل ڈالو تو اس کے کالے سفید تر مرے ناچنے بند ہو جاتے تھے۔ پھر گھنٹوں صحیح چلتا تھا۔ جب تک کہ چینل نہ بدلو۔ چینل بدلی اور پھر وہی دھمو کے تھپڑ، گرم پانی کی بوتل، وہ پھر چل پڑا۔

تو صاحب یہ تو ہوائی کا ازدواجی رخ تھا۔ اب تک گریسٹن ماں، بیوی، بول رہی تھی۔ لیکن یہ گریسٹن ماں بیوی دو وقت بلکہ اگلے دو دن کا اکٹھا کھانا پکا کر ریفریجریٹر میں بھر کر آزادی کا سانس بھی لیتی تھی۔ جگہ جگہ سیر پر خود نکل جاتی تھی۔ لائبریریوں سے گود بھر کر جزائر ہوائی بلکہ سارے بحر اکا بل کے جزائر پر کتابیں لاتی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگوں سے ملاقات، پروفیسر صاحبان سے گفتگو، سیاحوں اور طلبہ سے میل جول، بہت اچھا وقت گزرا۔ ہونولولو کے مختلف مدارج ابھرنے شروع ہوئے۔ اس کی ہمہ گوں زندگی کی چاشنی کا چسکا لگ گیا۔

ہوائی میں امریکہ کی فیڈرل حکومت نے ایک عظیم الشان مرکز کھولا ہے جسے ”ایسٹ ویسٹ سنٹر“ کہتے ہیں۔ اس کی حسین حدود اور عمارات میں مغرب اور مشرق کے عالم مدعو کیے جاتے ہیں۔ جو سینئر کارلسٹ کہلاتے ہیں۔ وہ مرکز کے

خرچ پر آتے ہیں۔ ہزار بارہ سو ڈالر کا وظیفہ ہر مہینے پاتے ہیں۔ اس ننھے سے وظیفے میں ایک خاندان ٹھاٹ کر سکتا ہے۔ دس مہینے یا سال کورس کی میعاد ہوتی ہے۔ اس دوران میں جو مرضی آئے کیجیے، پڑھیے لکھیے، ریسرچ کیجیے، تاثرات قلمبند کیجیے، کوئی پابندی نہیں، کوئی امتحان نہیں، کوئی کلاس نہیں، کوئی وقت نہیں۔ میرے میاں اس آزادی پر لگن تھے۔ آپ کا آرام دہ کمرہ، ٹائپ رائٹر، غسل خانہ، بہترین لائبریری، ساتھ ہی سستا اور مزے کا ریستوران، ارد گرد لڑکے، لڑکیاں، آزادی کی فضا اکثر عالم سگریٹ کا دھواں اور غپ اڑاتے پائے جاتے تھے لیکن کوئی رپورٹ کرنے والا نہیں تھا۔ کچھ عالم کتابیں بھی لکھ جاتے ہیں جو یہ مرکز بہت فخریہ شائع کرتا ہے۔

ہاں تو ایسٹ ویسٹ سینٹر اور ہوائی کی یونیورسٹی میں یوں تو ارضی قربت ہے لیکن ازلی رقابت بھی ہے۔ کسی حد تک یہ رقابت صحت مند بھی ہے۔ امریکہ کے بہترین پروفیسر اور اعلیٰ ذہن سردی گرمی لیکچر کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ طرح طرح کی نمائشیں، فلم، جشن منائے جاتے ہیں۔ اس کی جدید عمارات کے سامنے لمبی سے لمبی موٹریں جو آدھی طلبہ کی اور آدھی پروفیسروں کی ہوتی ہیں، امریکہ کی افراط کا صحیح ثبوت ہیں۔

اس مغرب و مشرق کے مرکز کا ایک جاپانی باغ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اتنا ”ایمان شکن“ ہے کہ میں اکثر لائبریری جاتے جاتے اس میں گھس جاتی تھی۔ جزائر ٹینیسی کے پھول خصوصاً گارڈینیا، زرد چنبیلی، کنول، کچا کچا سبزہ، نڈھال پانی اور رنگین مچھلیاں اور اس کی پشت پر متنوع درختوں کا ذخیرہ۔

اس ایسٹ ویسٹ سینٹر کے علاوہ یونیورسٹی کامیوں میں پھیلا ہوا احاطہ بھی ایک دیدہ زیب سبزہ زار ہے۔ ہر قدم پر گل آویزاں روشیں اور بتدریج باڑیں، لیکن اس کے علاوہ جو سب سے دل پذیر عنصر اس فضا میں پایا جاتا تھا وہ تھا بین الاقوامی طلبا کا ربط ضبط۔ جنوبی بحر الکاہل سے لے کر جاپان، انڈونیشیا، برما، ملایا، فلپائن، کوریا، ویتنام، فجی کے جزائر، آسٹریلیا، پاکستان، ہندوستان، یورپ اور امریکہ کے جواں سال جویندگان علم، یہ معاشرتی تنوع بھی ایک تعلیمی حیثیت رکھتا تھا۔

(دھنک پر قدم)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے:

- الف - نیچے بحر الکاہل ہوتا ہے اور اوپر خدا، کہیں زمین کا ذرا سا ٹکڑا بھی ڈھارس کے لیے دکھائی نہیں دیتا۔
 ب - اگر ۲۶ کو جانا ہو تو ۲۵ کی سیٹ بک کراؤ کیونکہ وہ چودہ سو چالیس منٹ سے کم لیٹ ہونا کر شان سمجھتی ہے۔
 ج - خدا کسی شریف انسان کو کلکتے نہ لے جائے۔ اگر مرزا غالب نے اس میں کچھ دیکھا تو ہندوستانی کسٹم آفیسر اور بنیا پولیس سے پہلے دیکھا ہوگا۔
 د - جب ٹو کیو سے ہوائی جاؤ گی تو ہوائی جہاز ایسے اچھلے گا جیسے چھانچ میں گیہوں۔
 ہ - سارا سفر آسمانوں میں ریشم کی طرح سرسرتا گزر گیا۔
 و - ڈھلتے سورج میں بحر الکاہل کروٹیں لے رہا تھا اور چاروں طرف زمرد کی آمریت مستحکم ہو چکی تھی۔
 ز - سپر مارکیٹ امریکن سرمایہ داری کا مکمل مظاہرہ اور امریکن طرز حیات کا بنیادی قلعہ اور اس کی لامحدود افراط کا ذخار ہے۔

۲۔ درج ذیل محاورات اور ضرب الامثال کو جملوں میں استعمال کیجیے:

- اوکھلی میں سردیا تو دھمکوں سے کیا ڈرنا، دھکے کھانا، اِنسا اِنسہ پڑھنا۔ خاک چھاننا، بلی کی طرح گھر بدلنا، شیطان کی آنت ہونا، پیٹ میں ہول اٹھنا، ٹھیک لگانا، آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونا، پھول نچھاور کرنا
 ۳۔ ”سفر نامے کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو معلومات اور تفصیل اس طرح مہیا کرے کہ پورا ماحول سمجھ میں آجائے۔“ آپ نے اپنے ملک میں یا ملک سے باہر کسی جگہ کا سفر کیا ہو تو اس کا حال اپنے لفظوں میں لکھیے۔
 ۴۔ درج ذیل مصادر کو امدادی افعال کے طور پر اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:
 دینا، چکنا، آنا، جانا، اٹھنا، رہنا، ہونا، کرنا، لینا، چاہنا، رکھنا
 ۵۔ درج ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کی مدد سے واضح کیجیے:
 الامان، مراجعت، شیرخوار، ذخار، اختراع، توسل، تنوع، واللہ اعلم
 ۶۔ بیگم اختر ریاض الدین کا مشہور سفر نامہ ”سات سمندر پار“ اپنے کالج کی لائبریری سے لے کر پڑھیے۔

آپ بیتی:

اپنی ذاتی سرگذشت یا ذاتی احوال و واردات کا تحریری بیان آپ بیتی یا خودنوشت کہلاتا ہے۔ انگریزی میں اسے آٹو بائیو گرافی کہتے ہیں۔

کسی جان دار چیز کی آپ بیتی ہو یا کسی بے جان شے کی، اس کے اہم اصول یہ ہیں:

الف۔ آپ بیتی میں واحد متکلم کا صیغہ (میں) استعمال کیا جاتا ہے۔

ب۔ آپ بیتی لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مشاہدہ اور مطالعہ بڑا گہرا ہو اور فرضی واقعات اور نقل پر بھی اصل کا گمان ہو۔

ج۔ واقعات اور حالات میں ایک منطقی ربط اور تسلسل ہو اور زبان روزمرہ گفتگو کے عین مطابق ہو۔

مندرجہ بالا باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اب آپ ایک دس روپے کے بوسیدہ نوٹ کی آپ بیتی لکھیے۔

